جوہر آئینہ

یعنی

آئینہ

(جس میں ہماری شاعری نوشتہ جناب مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی مفصل تنقید ہو گی) کی جلد اول قسط اول

مصنفہ

عالیجناب مولوی محمد احمد صاحب تجوید موہانی (ایم اے) پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ

پبلشر۔ انوار بک ڈپو

باہتمام احقر زمن محمد حسن

انوار المطابع لکھنؤ میں طبع ہوئی

قیمت ۵ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

26796

بیا و رید گر اینجا بود زباندانی
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

"گنجینۂ تحقیق" کی اشاعت کے بعد خامۂ حقیقت نگار آرام کی نیند سویا اور
یون سویا کہ پھر جنبش کیسی کروٹ تک نہ بدلی اب مدت کے بعد بیدار ہوا ہے اور

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکدان کیے ہوئے

پھر جی مین ہے کہ کچھ وقت عزیز تنقید کے "لاؤ لشکر" کی نذر کیا جائے
اور اس غرض سے مین نے "ہماری شاعری" مؤلفہ جناب مولوی سید مسعود حسن صاحب
رضوی ادیب ایم اے۔ صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کو انتخاب کیا ہے
جناب مؤلف اور انکی کتاب شعرا و فصحا کے طبقے اور ادبا و کملا کے حلقے مین محتاج
تعارف ہون تو ہون لیکن سررشتۂ تعلیم انھین خوب جانتا ہے سنتا ہون کہ جناب
مؤلف کئی یونیورسٹیون کے ممبر ہین اور انکی یہ کتاب کئی یونیورسٹیون کے نصاب
مین داخل ہے جب یہ کتاب پہلے پہل شائع ہوئی تھی تو ارادہ ہوا تھا کہ اسپر مفصل
تنقید کر دیجائے۔ مگر خیال گذرا کہ ہندوستان ابھی ارباب سخن سے خالی نہین کوئی
نہ کوئی اسے تنقید کی کسوٹی پر کس لیگا۔ یہ بلا اپنے سر کیون لیجائے مگر صدائے برنخاست
کا عالم رہا۔ اخبارون مین تعریفون کا غلغلہ اور رسالون مین تعریفون کا ہنگامہ رہا مگر
تنقید اسپر آجتک ڈھونڈھے نہین ملتی بعض احباب نے ادھر کچھ دنون سے توجہ بھی فرمائی
اور چلتی ہوئی نظر بھی ڈالی مگر یہ وہ ہے پیشتر سے بدل کر رہ گئے اسکا واقف سبب علام الغیوب ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آخری اشاعت

ہماری شاعری کا مقدمہ صفحہ ۹۷

"ارشاد جناب ادیب "مناسبت الفاظ۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک لفظ کی مناسبت خیال سے۔ دوسری لفظ کی مناسبت لفظ سے پہلی صورت بلاغت کلام میں داخل ہے۔ دوسری فصاحت کلام میں۔ پہلی صورت کی پھر دو حیثیتیں ہیں ایک مناسبت آواز کے اعتبار سے دوسرے مناسبت معنی کے اعتبار سے۔ اس طرح مناسبت الفاظ کی تین شکلیں ہوئیں۔ ذیل میں ہر شکل کا بیان کسی قدر تشریح کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

لفظ کی مناسبت خیال سے بہ اعتبار آواز کے۔ بعض لفظوں کی آواز نرم اور نازک ہوتی ہے۔ بعض کی سخت اور کرخت بعض کی آواز شیریں اور لطیف ہوتی ہے۔ بعض کی بھیانک اور مہیب اس لئے جیسی بات کہنا ہو ویسے ہی لفظ لانا چاہئے محبت کا اقرار نرم لفظوں میں ہونا چاہئے۔ غصے کا اظہار سخت لفظوں میں ایسا کرنے سے لفظوں کی آواز اُن کے معنی کو اور بھی واضح

کر دیتی ہے اور کلام کا اثر بڑھ جاتا ہے۔

مناسبت الفاظ کی پہلی صورت کی مثالین

جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا تمھیں منصفی سے کہدو تمھیں اعتبار ہوتا

"اس شعر مین عاشق معشوق سے وعدہ خلافی کی شکایت کرتا ہے اس لئے ایسے ہی نرم الفاظ مناسب تھے کہ محبوب کے نازک دل پہ گران نہ ہون۔ اور جو اثر مطلوب ہے وہی پیدا ہو۔ لیکن اگر کوئی فوجی افسر ماتحت سپاہیون سے عدول حکم پر باز پرس کرنے مین اسی طرح کے الفاظ استعمال کیا کرے تو جو اثر ہوگا وہ ظاہر ہے"

التماس تجوید۔ مولف علام نے شعر مذکورہ بالا کے الفاظ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ معشوق سے وعدہ خلافی کی شکایت مین ایسے ہی نرم الفاظ مناسب تھے کہ محبوب کے نازک دل پر گران نہ ہون۔ ایسے ہی جرات کا [illegible] ہون کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے اگر نرم الفاظ یہی ہین تو سخت الفاظ کیسے ہوتے ہین۔ مصرع اول "جو تمھاری طرح" سے شروع ہوتا ہے یعنی اشارہ کنایہ سے کام نہین لیا جاتا۔ ادائے مطلب کے لئے کسی اور واقعہ یا فرضی قصہ کی ضرورت نہین سمجھی جاتی بلکہ معشوق خود ہی مثال مین پیش کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ جب کلام کی ابتدا اس درجہ وحشی سے کی جائے وہ درشت مزاج آدمی کو آمادۂ جنگ کر دے گی اور نازک مزاج آدمی کو ہمیشہ کے لئے متکلم کی صورت کیسی نام سے بیزار کر دے گی یہ انداز کلام

ایک بدمعاش ایک مجرم کے مقابلہ میں برمحل ہو تو ہو کسی نازک دل کسی نازک مزاج کے لئے تو دشنام سے کم نہیں پھر وہ نازک دل نازک مزاج کوئی اور بھی نہیں خود معشوق ہے ایسی صورت میں ایسی مثال کہاں تک مناسب ہے اس کا فیصلہ ارباب نظر کر سکتے ہیں اچھا اور آگے بڑھئے "تم سے" دیکھئے ضمیر کس قدر نزاکت اور نرمی کا پہلو لئے ہوئے ہے یاد رہے کہ یہ محل شکایت ہے اور شکایت بھی نازک مزاج اور نازک دل معشوق سے جب آمادۂ رحم کرنا منظور ہے اب ظاہر ہے کہ اس شکایت کا انجام صلح مستند بلا شک ہے۔

۳ "جھوٹے وعدے کرنا" - یہاں تو نرمی کی حد ہو گئی ہے اپنے معشوق سے سے کہا جا رہا ہے جو نازک مزاج اور نازک دل ہے اور کس بیباکی سے کہ تم جھوٹے وعدے کرتے ہو۔

۴ دو مصرعے سے کہہ دیا۔ تم نا منصف بھی ہو۔

۵ "مصرعے سے کہا وہ تمہیں اعتبار ہوتا" یعنی غیر تو غیر تم خود بھی اعتبار نہ کرتے۔

مختصر یہ کہ دو مصرعوں میں اتنی نرمیاں موجود ہیں۔ تمہاری طرح تم جھوٹے ہو۔ تم نا منصف ہو۔ تم اعتبار کے قابل نہیں۔

اگر معشوق حقیقتاً نازک دل اور نازک مزاج ہوتا اور کسی سچے اور مہذب عاشق کو یہی ضرورت پیش آتی تو وہ یوں کہتا ؎

مر چکا ہوں جو تم سے کوئی ایسے وعدے کرتا || تمہیں اپنے دل میں سوچو تمہیں کیا خیال ہے

ایسوں سے شکایت یوں کی جاتی ہے واقف ملتانی کہتا ہے ؎

مکدر گرنہ گردی با تو گویم   کہ باشت غبار من چہ کردی

کہا تھا بے وفا اک روز میں نے
ستمگر نے شکایت عمر بھر کی   سراج لکھنوی

اگرچہ آخری شعر مذاق عاشقان صادق میں پست مرتبہ کا ہے مگر معشوقان نازک مزاج کے ایک انداز کا آئینہ دار ضرور ہے۔ میں نے اس شعر کو پست بتایا ہے اُس کا سبب یہ ہے کہ ایسی اس بے محابا جرأت پر کہ معشوق کو بے وفا کہدیا عاشق کو عمر بھر کے بعد ندامت نہیں بلکہ اب دوسرا گناہ کرتا ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ سنگین ہے یعنی معشوق کو ستمگر کہتا ہے۔

اتنا کہدینے کے بعد اہل ذوق و ارباب نظر کے لئے کچھ اور بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی مگر حقیقت میں سمجھانا اُن کو ہے جو اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھتے جب تک کافی توضیح نہ کیجائے (طلبۂ اردو ام) اسلئے اپنی دی ہوئی مثال کے متعلق کچھ کہنا ضروری نظر آتا ہے۔

مصرع اول شروع ہوتا ہے "مہربان" سے اور ماہر نفسیات جانتا ہے کہ سخت بات کہنے میں ایسے الفاظ اور ایسا انداز اختیار کرنا چاہئے کہ مفہوم کلام کی کراہت قلب سامع کو زیادہ تکلیف نہ دے اور یہی سبب ہے کہ آغاز کلام "مہربان" سے کیا گیا ہے جس سے زیادہ پیارا اور محبت کا اظہار کسی اور لفظ سے مشکل نظر آتا ہے تا کہ

سننے والا سمجھ لے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے بمقتضائے محبت کہا جا رہا ہے۔
یہ ملامت گر کی ملامت ہے نہ واعظ کا وعظ نہ رندوں اور آزادوں کی
پھبتی نہ غیروں یا دشمنوں کا آوازہ بلکہ یہ بات وہ شخص کر رہا ہے جو
تم کو اپنی جان کے برابر ہی نہیں بلکہ اپنی جان سمجھتا ہے۔

پہلے شعر میں جو مفہوم "تمھاری طرح" کے ٹکڑے میں ادا کیا گیا ہے
وہ دوسرے شعر میں صرف "یوں ہیں" کہکر ادا کر دیا گیا ہے اور یہ بات
مؤلف علام کو زیادہ پسند آئے گی اس لئے کہ وہ اختصار کے شیدائی ہیں

دوسرا فرق جو اسی ٹکڑے سے پیدا ہو گیا ہے نازک ہے اور زیادہ
نازک اور وہ یہ ہے کہ "تمھاری طرح" سے صرف اتنا مفہوم نکلتا ہے
کہ معشوق برابر وعدہ خلافیاں کرتا چلا آتا ہے ایک دن عاشق نے
اس سے شکایت کی جو شعر میں مذکور ہے۔ مگر "یوں ہیں" کی لفظ میں
یہ سب باتیں شامل ہیں اور اسقدر مستزاد ہے کہ اس وقت بھی معشوق نے
کوئی ایسی بات کہی ہے جس پر "یوں ہیں" کہا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب
کسی ایسے موقع پر کوئی بات کہی جاتی ہے جب مخاطب سے کوئی ایسی
ہی بات ظہور میں آئی ہو تو وہ زیادہ متاثر ہوتا ہے ورنہ در صورت انکار
واقعات یاد دلانے پڑتے ہیں کبھی حریف اُن کا اقبال کرتا ہے
کبھی انکار۔

۳ "تمھاری طرح" ہر شخص جانتا ہے کہ صحت لفظی و معنوی کے
اعتبار سے "طَرَح" بحرکت رائے مہملہ اور "طَرْح" بسکون رائے غیر منقوطہ

ہین کوئی فرق نہین مگر رازداران ادب جانتے ہین کہ صرف صحت لفظی
اور ہے اور فصاحت اور۔ طرح کہنے مین "ح" کچھ اوجھل سی جاتی ہے
اور وہ لطافت و شیرینی اُس مین نہین رہتی جو طرح مین ہے اور کسی
کو زاھم کرنے مین وہ الفاظ جادو کا اثر رکھتے ہین جن مین نرمی روانی
اور شیرینی ہو۔

۵۔ "تم سے" کہا جا سکتا ہے کہ "تم سے" شعر اول مین بھی تھا اور شعر
آخر مین بھی ہے۔ وہان کیون بے محل تھا یہان کیون برمحل ہے اسکا
جواب صاف ہے وہان یہ ٹکڑا "تمھاری طرح" کے بعد واقع ہوا تھا۔
اور یہان "مہربان ہو ہین" کے نرم و لطیف و محبت خیز ٹکڑے کے بعد
واقع ہوا ہے۔ اور "مہربان" کی لطافت اور پیار نے تم کے سوا
آپ اور جناب کی گنجایش ہی نہین رکھی یہان یہ باتین پیار اور محبت
کی ہین اور وہان شکایت تھی اور وہ بھی درشت لہجے مین۔

۶۔ کوئی ایسے وعدے کرتا۔ ایسے کی بلاغت قابل دید و قابل داد
ہے اس لئے کہ معشوق جس کی وعدہ خلافیون کی شکایت کرنا مقصود
ہے بلا جس کے اس طرز عمل کی اصلاح منظور ہے وہ خود بھی خوب
جانتا ہے کہ وہ کیسے وعدے کرتا ہے جھوٹے یا سچے اس لئے اگر اُس کا
دل ہی دکھانا مطلوب ہو جو شان عاشقی کے خلاف ہے تو عاشق کو
اختیار ہے جو چاہے کہے ورنہ حقیقت مین جھوٹے وعدے کرنے والے
نازک مزاج و نازک دل معشوق سے ایسے وعدے سے زیادہ بلیغ

مہذب اور آمادہ رحم کرنے والے لفظ غالباً اس محل کے لئے خلق ہی
نہیں ہوئے اور اس شکایت کے مزے معشوق نازک دل و نازک
مزاج ہی اٹھائے گا کہ ظالم نے ملامت بھی کی تو کس دلکش اور پیارے
انداز سے اور عاشق کی مرتبہ دانی نکتہ فہمی اور موقع شناسی پر اس کی
طبیعت بے اختیار مائل ہو گی اور اس کا میلان ہی منتہائے آرزوئے عاشق ہو
گا۔ "تمھیں اپنے دل میں سوچو" گویا صاف ظاہر کرتا ہے کہ
عاشق معشوق کو نا منصف نہیں کہتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ تمھارے ایسے
وعدے عمداً نا کردہ میرا دل دکھانے یا مجھے محروم رکھنے کے لئے نہیں
ہیں نہ اس وجہ سے ہیں کہ تم خود بے انصاف نہیں رکھتے بلکہ تمھارا یہ
برتاؤ بے خیالی اور متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے ہے ورنہ تم جھوٹے
نہیں وعدہ خلاف نہیں نامنصف نہیں دل آزار نہیں بات اتنی ہے
کہ تمکو ان امور پر غور کرنے کا خیال ہی نہیں آیا موقع ہی نہیں ملا ورنہ
تم اور ایسا کرتے معاذ اللہ۔

۸۔ "تمھیں کیا خیال ہوتا" کہا یہی کہ تم کو خود ایسے وعدوں پر اعتبار
نہ آتا اگر اس دل آویز انداز سے کہ باوجود شاید وہ خود اسے جھوٹا کہنے کی
جرأت نہیں کرتا بلکہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا اس لئے کہ وہ خوب
جانتا ہے کہ اس عبارت کا مفہوم کیا ہے۔

دفع دخل۔ کہا جا سکتا ہے کہ نواب صاحب کے پیش کردہ شعر کے متعلق
جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت میں مرزا داغ علیہ الرحمہ سے کہا گیا ہے

مگر مین عرض کرون گا نہین ایسا نہین ہے اس لئے کہ ہر عاشق کا فرض
یہ ہے کہ اپنے معشوق کے عادات و شمائل طرز بود و ماند آداب و اخلاق
سے، واقف ہو اور جانتا ہو کہ معشوق نازک مزاج ہے یا بھولا بھالا بلند
فطرت ہے یا پست فطرت عالی خاندان ہے یا مجہول النسب عصمت مآب
ہے یا عصمت فروش تربیت شریفانہ پائی ہے یا نہین بد مزاج ہے یا خوش مزاج
تاکہ اُس کی حماقت سے بنا بنایا کھیل بگڑنے نہ پائے اس لئے مرزا داغ
مرحوم نے جس محل پر کہا ہے بر محل کہا ہے ہان اگر مرزا سے مرحوم کا
دعویٰ ہوتا کہ یہ شعر نازک دل نازک مزاج معشوق سے وعدہ خلافیون
کی شکایت کے محل پر کہا گیا ہے تو بیشک اُن کی خدمت مین بھی وہی
عرض کیا جاتا جو ہماری شاعری کے مؤلف کی خدمت عالی مین عرض کیا گیا

آخر مین کہنا ہی پڑتا ہے کہ ارباب نظر دیکھین کہ ہمارے جناب
ادیب کہان تک ادب آشنا ہین۔

آخری اشاعت

• ہماری شاعری کا مقدمہ صفحہ ۴۲

ارشاد حضرت ادیب (۲) "اختصار یعنی کم سے کم لفظون مین مطلب
ادا کیا جائے اور ضرورت سے زیادہ بات کو طول نہ دیا جائے اگر طول
مناسب مقام ہو طول فضول نہ ہو تو وہ اختصار کے منافی نہین ہے
اختصار سے یہ مطلب ہے کہ کوئی لفظ اور کوئی فقرہ بے ضرورت اور

بیکار استعمال نہ کیا جائے۔

اختصار کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لفظ "ایجاز" کی قدیم اصطلاح کا مرادف نہیں ہے ایجاز ہو یا اطناب یا مساوات اگر مقتضائے مقام کے موافق ہو گا تو اختصار کے تحت میں آجائے گا۔

ذیل کی مثالوں سے واضح ہو جائے گا کہ جتنا مطلب کسی عبارت میں ادا کیا گیا ہے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ اس عبارت میں سے کچھ لفظ نکال ڈالنے کے بعد بھی ادا ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اختصار سے کلام کا اثر بڑھ جاتا ہے"۔

التماس ہے کہ - اس وقت مصنف علام کی وہ حالت نظر آتی ہے جو مرض کے بحران اور مادہ کے ہیجان میں ہوتی ہے۔ یعنی ہیجانی دیکھئے کہ اختصار کے سمجھانے میں کس قدر طول دیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"اختصار یعنی کم سے کم لفظوں میں مطلب ادا کیا جائے"۔ دل کی بات سمجھا دینے کے لئے یہی ایک جملہ کافی تھا پھر بھی دوسرا جملہ آتا ہے "اور ضرورت سے زیادہ بات کو طول نہ دیا جائے"۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے سے کچھ زیادہ نہیں سمجھاتا۔ اگر طول مناسب مقام ہو، اتنا ہی ٹکڑا کافی تھا اس پر یہ ٹکڑا مستزاد کیا جاتا ہے "طول فضول نہ ہو"۔ یہاں تک پہونچکر بھی بے بدل انشا پرداز

کی تسکین نہیں ہوتی اب یہ لکھا جاتا ہے۔ اختصار سے یہ مطلب ہے کہ
کوئی لفظ اور کوئی فقرہ بے ضرورت اور بیکار استعمال نہ کیا جائے
لفظ فقرہ کا جزو ہوتا ہے اس لئے کوئی فقرہ بلکہ کوئی لفظ کہنے کا محل
تھا جہاں یہ اُلٹی گنگا بہائی گئی ہے اگر فقرے کے بعد "لفظ" کی لفظ آتی
تو تاکید اور زور کلام کا فائدہ دیتی مگر یہاں یہ بات بھی نہ پیدا ہوئی
سب کے آخر میں "بے ضرورت" کے بعد بیکار لکھنا بھی تحصیل
حاصل ہے۔ اور منافیٔ اختصار۔

"ہماری شاعری" جب اول مرتبہ شائع ہوئی تھی تو اس میں
اختصار کے متعلق اتنی ہی عبارت صفحہ ۳۰ میں تھی جتنی "یعنی کم سے
کم لفظوں سے شروع ہو کر بے ضرورت اور بیکار استعمال نہ کیا
جائے" پر ختم ہوتی تھی اس پر کسی اللہ کے بندے نے یہ اعتراض کیا تھا
کہ حضرت اختصار کی دھن میں ایجاز۔ مساوات۔ اطناب کے گلے
پر چھری پھر گئی۔ آخری اشاعت میں مصنف علّام نے اس کا جواب
ان لفظوں میں دیا ہے

اختصار کی جو تعریف یہاں بیان کی گئی ہے اس سے صاف
ظاہر ہے کہ یہ لفظ ایجاز کی قدیم اصطلاح کا مرادف نہیں ہے۔ ایجاز
ہو یا اطناب یا مساوات (کیسی صحیح اور بامحاورہ اردو ہے) اگر
مقتضائے مقام کے موافق ہوگا تو اختصار کے منافی نہیں۔۔۔
۔۔۔ اس کے متعلق یہ عرض کرتا ہے کہ جناب علّامہ یا اعث ان تمام باتوں کیلئے

پہلے ہی)۔ اصطلاحیں معین فرمادی ہیں تو اس زحمت فرمائی کا مآل سمجھ میں نہیں آتا اتنے لفظ پہلے سے مشہور چلے آتے ہیں۔

کلام جامع و مانع - جس میں کوئی ضروری جزو چھوٹ نہ جائے اور کوئی غیر ضروری جزو بڑھ نہ جائے فضول الفاظ کے لئے حشویات و زوائد۔ کلام مختصر کے لئے ایجاز۔ کلام طولانی کے لئے اطناب۔ کلام متوسط کے لئے مساوات۔ ایجاد اصطلاح کی ضرورت اسوقت پیش آتی ہے جب پہلے سے کوئی لفظ ان مطالب کے ادا کرنے کے لئے موجود نہو اس لئے یہ ایجاد غیر ضروری ہے - اور لا مشاحۃ فی الاصطلاح کی سپر یہان آڑے آتی نظر نہیں آتی +

اب ہم تو لعشا سے بےبدل کی اُن مثالوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔

اشاعت آخر

ہماری شاعری کا مقدمہ صفحہ ۴۸ و ۴۹

ارشاد حضرت ادیب - "ذیل کی مثالوں سے واضح ہوجائے گا کہ جتنا مطلب کسی عبارت میں ادا کیا گیا ہے اُتنا ہی بلکہ اُس سے زیادہ اس عبارت سے کچھ لفظ نکال ڈالنے پر بھی ادا ہوسکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ اختصار سے کلام کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ پہلی مثال مرزا دبیر مغفور کی ایک رباعی ہے۔

ناداں کہوں دلکو کہ خردمند کہوں — یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
دیجیے اک روز خدا کو سندِ دکھانا ہو مجھ کو — بندوں کو میں کس منہ سے خداوند کہوں

کسی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے :-

دل کو ناداں کہوں یا وضع کا پابند کہوں
مجھ سے ہوتا نہیں بندوں کو خداوند کہوں

"اس شعر کے پہلے مصرع میں او پہلی رباعی کے پہلے دو مصرعوں کا مضمون پورا سما گیا ہے اور مجموعی حیثیت سے یہ شعر خوبی روانی اور اثر میں اس رباعی سے کس قدر بڑھ گیا ہے یہ زیادہ تر اختصار کلام ہی کا نتیجہ ہے"

التماس بیخود - اس میں تو شک نہیں کہ اختصار بھی کلام کی ایک خوبی ہے مگر اسی حالت میں جب کہ جو کچھ کہنا ہے سب مختصر لفظوں میں خوبصورتی سے کہہ لیا جائے - (دیکھنے کی بات یہ ہے) یہاں مثال میں ایک تو رباعی ہے جس میں چار مصرعوں کا پُر کرنا ضروری ہے اور وہاں صرف ایک شعر ہے اور وہ بھی جس بحر میں ہے وہ ایسی ہے کہ اسمیں اُتنے ہی کم لفظ سما سکتے ہیں اس لئے یہ تقابل صحیح ...... نہ ٹھہرا جو شخص اوزان رباعی سے واقف ہے وہ اس رباعی میں جناب مؤلف کے پیش کردہ شعر سے کہیں زیادہ خوبصورتی روانی برجستگی لطف زبان حسن محاورہ چستی بندش تاثیر اور خدا جانے کیا کیا پاتا ہے اور اضافہ معنی مستزاد برآں - یہ رباعی ..... مصرع نکالڈالنا آنکھ

چنانچہ دبیر کی رباعی ایک مسلسل داستان ہے اور خیال کی سیر کا
دلکش مرقع۔ اور مؤلف کا پیش کردہ شعر اُس کا ایک جزو ناقص نظر آتا ہے
میں پہلے مؤلف کے پیش کردہ شعر کی توضیح کر دوں تاکہ رباعی دبیر کی
توضیح خود ہی دونوں کا فرق ظاہر کر دے۔

شعر مؤلف کی توضیح۔ اگرچہ دنیا والوں کی دنیا دیکھی میرا بھی
جی چاہتا ہے کہ بندوں کو خداوند کہوں اُن کی خوشنودی حاصل کروں
نفع اُٹھاؤں اپنی عزت بڑھاؤں مگر کیا کروں اپنے دل سے مجبور ہوں
مجھ سے تو بندوں کو خداوند نہیں کہا جاتا اچھا ہے اسے میرے دل
کی حماقت سمجھ لیا جائے وضع کی پابندی کہہ لو چاہے یوں کہیں اپنی فطرت
سے مجبور ہوں اس کا بدلنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس میں شک
نہیں کہ مجھ سے ہوتا نہیں کا ٹکڑا بہت ہی خوبصورت ہے مگر دبیر کی رباعی
میں کس منہ سے کا ٹکڑا اس کا بدل نہیں ہو سکتا

توضیح رباعی دبیر

ناداں کہوں دل کو کہ خردمند کہوں — یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر — کس منہ سے میں بندوں کو خداوند کہوں

ایک شخص ہے کہ بندوں کے لئے سرکار اور خداوند کے الفاظ اُسکی
زبان سے نہیں نکلتے اور اُس سے دنیوی مفاد میں خلل پڑتا ہے اس لئے
کہ خوشامد پسندی اکثر صاحبان جاہ کی خو بلکہ سرشت ہو جایا کرتی ہے وہ
حیران ہے اور سوچ رہا ہے کہ آخر حقیقت کیا ہے میرا دل ناداں ہے

یا عقلمند یعنی ایسا کرنے میں حق بجانب ہے یا غلط کار اب سلسلۂ
خیال آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے ممکن ہے کہ میرے دل کے اس فعل
کا تعلق نہ دانائی سے ہو نہ نادانی سے بلکہ زنجیرِ وضع میں جکڑے ہونے
کے سبب سے ہو مگر تسکین قلب نہیں ہوتی خیال کچھ اور آگے بڑھتا ہے
اور سوچتے سمجھتے حقیقت پردہ فگن ہوتی ہے اور اصل راز اس کی
سمجھ میں آتا ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے اچھا اب سمجھا
میرے دل کا یہ فعل وجدِ اثباتِ صحیح کی بنا پر ہے اور اس کی شرح
یہ ہے کہ ایک دن (روزِ قیامت) خدا کا سامنا کرنا ہے جس کے سوا
نہ کوئی خداوند ہے نہ اس جلیل القدر نام سے پکارے جانے کے قابل
ہے میں بندوں کو خداوند کہنے کی جرأت کہاں سے لاؤں۔ مختصر یہ کہ
اس شعر میں اتنے عالموں کا ذکر ہے۔ عالمِ حیرت سوال کا پیدا ہونا
پھر خیال کا غیر واقعی اسباب کو اسباب حقیقی سمجھنا۔ کبھی اپنے اس فعل
کو نادانی کی کارفرمائی جاننا کبھی دانائی کی کرشمہ سازی گرداننا۔ پھر
وضعداری کی طرف خیال کا جانا۔ پھر دلیل کا قائم ہونا اور اس کے
بعد اصل حقیقت کا ذہن میں آنا جس پر انشراحِ خاطر ہونا ضروری
ہے آخر میں دل کے اس فعل کو وجدِ اثبات کی معجزہ آرائی کا نتیجہ پانا
یعنی یہ سمجھنا کہ دل کا اس امر سے ابا کرنا بمقتضائے فطرتِ عالیہ ہے
اور یہ وہ مقام ہے جہاں اہلِ دل کے لئے سجدۂ شکر میں گر جانا واجب
ہو جاتا ہے۔

ناداں کہوں دلکو کہ خردمند کہوں | یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک وہ نہ خدا کو منھ دکھانا ہے دبیر | کس منھ سے میں بندوں کو خداوند کہوں

شاعر کا خیال اسوقت عالم حیرت کی سیر کر رہا ہے اب اسی عالم کی دوسری منزل کا تماشائی ہے اب دلیل قائم ہوتی ہے اور اصل راز منکشف ہوتا ہے اب آخری فیصلہ ہوتا ہے اور شاعر اپنے فعل کو محمود سمجھتا ہے۔

معنوی خوبیاں مختصرا بیان کیا چکیں اب لفظی خوبیاں مجملاً دکھائی جاتی ہیں "ناداں" و "خردمند" میں صنعت تضاد ہے "سلسلہ" و "پابند" میں مراعات النظیر ہے "خدا کو منھ دکھانا" اور "کس منھ سے" وہ الفاظ جمع ہوگئے ہیں کہ مذاق سلیم وجد کرتا ہے اس لئے کہ ان الفاظ کے جمع ہونے میں تکلف و تصنع کو دخل نہیں۔

دوسرے شاعر نے خردمند کا ٹکڑا اڑا دیا اور یہ نہ سمجھا کہ اس میں اتنے معنی پوشیدہ تھے کہ ابھی تک متکلم نہ اپنے فعل کو نادانی سمجھ سکتا ہے نہ دانائی اور عالم حیرت کے نظاروں میں سے یہ نظارہ حذف ہوگیا صرف ناداں کہوں اور پابندی وضع کے شکوے پہلے مصرع میں باکے پھر بھی جو کچھ مؤلف کے پیش کردہ شعر میں رہ گیا ہے وہ جناب دبیر کی رباعی کی کرامت ہے اس لئے کہ یہ شعر اگرچہ ناقص ہے مگر ہے اسی رباعی کا خلاصہ سچ کہا ہے کہنے والے نے الولد سر لابیہ اسوقت جناب دبیر کی روح یہ کہتی ہے

تم نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ابجان اسے کیا کہتے ہیں

ہماری شاعری کا مقصد   آخری اشاعت   صفحہ ۴۹

ارشاد جناب ادیب ""دوسری مثال۔ خدائے سخن میر تقی میر کا ایک شعر ہے

میر

بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پر   جو ہماری خاک پر سے ہو کے گذرا رو گیا

اس شعر کو مختصر کر کے یوں بھی پڑھ سکتے ہیں ؎

بیکسی برسا کی اپنی گور پر   جو ادھر سے ہو کے گذرا رو گیا

دونوں مصرعوں سے کچھ لفظ کم کر دئے گئے مگر معنی میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ کچھ زیادتی ہو گئی "مدت تلک" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اب بیکسی نہیں برستی ان لفظوں کو نکال ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے نے صرف گذشتہ زمانے کے بارے میں ایک خبر دی ہے اور زمانۂ حال سے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس لئے کوئی چیز ہمیں اس خیال سے نہیں روکتی کہ اب بھی بیکسی برستی ہے"۔

التماس بیخود۔ اس مقام پر جناب ادیب نے ایسی ستم ظریفی کی ہے کہ اس کی داد نہ دینا گناہ ہے آپ نے میر علیہ الرحمہ کے نام کے ساتھ اُن کا مشہور خطاب لکھدیا ہے یعنی خدائے سخن پھر اپنی بندگی کو معراج پر پہونچانے کے لئے اُسی خدا کے کلام میں اصلاح بھی فرما دی ہے اور کرنا بھی یہی چاہئے تھا اب وہ زمانہ کہاں ہے جب کہ بندے خدا کی خدائی پر ایمان لاتے ہی اسکے کلام پر اعتراض کرنا شان بندگی کے

خلاف سمجھتے تھے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس بندہ معصوم اس بھولے بھالے نقاد کو یہ خبر نہین کہ اُسنے "خدائے سخن" کی جناب مین کیسی گستاخی اور دریدہ دہنی کی ہے اس لیے کہ ارشاد ہو رہا ہے کہ کچھ الفاظ کم کر دینے سے معنی مین کوئی کمی نہین ہوتی بلکہ کچھ اور زیادتی ہوتی ہے اس کے معنی تو یہی ٹھہرے کہ میر کے شعر مین اتنے الفاظ بیکار رکھے گئے تھے جنھین اصطلاح مین حشویات و زوائد کہتے ہین جب یہ الفاظ ضرورت سے زائد تھے تو ان کا عبث ہونا ظاہر ہے کسی کو خدا کہنا (وہ مجازاً ہی سہی) اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے نقص کی طرف اشارہ کرنا دانشمندانہ فعل نہین۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے الفاظ کے کم کر دینے سے معانی و لطافت شعر مین کھلی کھلی کمی ہوگئی ہے یہان جناب ادیب کو اپنا وہ ارشاد یاد نہین رہا جو ہماری شاعری (آخری اشاعت) کے صفحہ ۵۹ پر ان لفظون مین نظر آتا ہے:-

ارشاد حضرت ادیب بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کئی لفظ ایک ہی چیز پر دلالت کرتے ہین مگر ان لفظون کے لغوی معنی یکسان نہین ہوتے اس لیے اُس کا اثر بھی یکسان نہین ہوتا مثلاً رزاق، قہار، غفار، خلاق، ان سب لفظون سے مراد خدا ہی ہے۔ مگر ہر لفظ سے خدا کی ایک خاص صفت ظاہر ہوتی ہے اس لیے اُن لفظون کو استعمال کرتے وقت مناسبت مقام کا لحاظ رکھنا

ضروری ہے اگر خدا سے رزق مانگنا ہو تو رزاق کہکر پکارے ۔ الخ
التماس بیخود۔ مختصر یہ کہ شعر کی اصلاح فرمائی تھی تو میر کو خدائے سخن
کے بجائے کسی ایسے خطاب سے یاد کرنا تھا جو مناسب مقام ہوتا
اس شعر میں۔
بیکسی مدت تلک برسا کی اپنی گور پہ ۔ جو ہماری خاک پر سے ہو کے گذرا رو گیا
بقول مؤلف دو ٹکڑے زائد تھے ۔ مدت تلک ۔ اور ہماری خاک ۔

مولف علام کی ترمیم سے شعر کے معنی یہ ہوگئے کہ ہماری گور پر ہمیشہ
بیکسی برستی رہی اور جو اس طرف سے ہو کے گذرا وہ رویا ضرور اور یہی
اضافہ معنی ہے سبحان اللہ سبحان اللہ کیا کہنا ۔ یہ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد
کہنے کا محل ہے ۔ مصنف شعر (میر تقی) یہ نہیں کہتا بلکہ کچھ اور کہتا ہے
وہ یہ کہ ایک زمانہ دراز تک ہماری قبر پر بیکسی برستی رہی اس کے بعد
کے زمانے کا حال لفظاً کچھ بیان نہیں کرتا مگر یہ ٹکڑا ہے معنی خیز اور
بتا رہا ہے کہ ایک مدت تک یہ عالم رہا یعنی بیکسی برستی رہی اور اب نہیں
برستی اس لیے کہ اب نہ قبر باقی ہے نہ نشان قبر بیکسی برسے تو
کس پہ برسے "مدت تلک" کا ٹکڑا واقعیت سے دست و گریبان ہے
اور صرف برسا کی میں ہمیشگی کی شان نکلتی ہے جو بیکسی کے خلاف ہے
واقعہ کے خلاف ہے قیاس کے خلاف ہے وہ یوں کہ جس قبر کا کوئی
پرسان نہ ہو وہ ایک زمانہ تک رہے گی پھر قبر کیسی نشان قبر بھی نہ رہیگا
مانا کہ ادھر سے کوئی سڑک نہ نکلی کوئی بستی وہاں نہ بسی زراعت نہ ہوئی

مردے کی ہڈیاں نکال کر کوئی اور لاش نہ دفن کی گئی پھر بھی انقلابات
عالم و مقتضیات فطرت کو کون مانع ہے اُس میں دھوپ سے دراڑیں
پڑینگی کیڑے اُسے چھلنی کریں گے حشرات الارض اُسے اپنا مسکن
بنائیں گے مینھ کے تیر اُس پر برسیں گے سیل اُدھر آئے گی پانی
اُس میں مرے گا زلزلے اُسے کروٹ بدلوائیں گے آندھیاں اُسے
اُڑائینگی راہگیر اُسے پامال کریں گے جب کوئی خبر لینے والا ہی نہیں
تو ایک مدت بعد اس عبرت خیز منظر پر فنا کا پردا گرے گا حضرت میر بھی
فرماتے ہیں کہ جب تک قبر رہی اُسپر بیکسی برستی رہی ایک مدت بعد قبر
ہی نہ رہی اور یہی مآل انتہائے بیکسی ہے مختصر یہ کہ
مدت تلک کے ٹکڑے سے اُس زمانہ دراز کا گریہ خیز و عبرت انگیز
منظر آنکھوں میں پھرنے لگا۔ خیال۔ انداز بیان۔ انتخاب الفاظ سب مطابق
واقعہ ہیں پہلے مصرعہ میں "گور" قبر کے معنی کا ایک عام لفظ رکھا تھا دوسرے
مصرع میں بیان کو زیادہ موثر و دلگداز بنانے کے لیے "ہماری خاک کہا
اسے حشو کہنا سخن سنجی کے گلے پر چھری پھیرنا ہے میں اپنے مفہوم کو زیادہ
واضح کرنے کے لیے یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ بیکسی اُن کی قبروں پر برستی
ہے جنکے چاہنے والے اور خاندان نیست و نابود ہو جاتے ہیں یا جن کے
اعزہ و احبا ایسے نااہل ہوتے ہیں کہ جس دن سے دفن کر آئے اُدھر
مڑ کر بھی نہ دیکھا اور قبر ایک مٹی کے چراغ اور چار پھولوں کو ترسا کی فاتحہ خوانی کا
اُدھر گذر نہ ہوا پھر قرآن خوانی و مجلس عزا و میلا و کا کیا ذکر ہے قبر میں

شکستگی کے آثار پیدا ہوے تو کسی نے خبر نہ لی بسیں بہا لیگئی تو کسی کو پروا نہوی ایک دن قبر پر جھاڑو نہ دی گئی پھر عرس کہان کا اور چادر کس کی۔ اس کا انجام کیا ہے قبر کا مٹ جانا ایسی قبرین بامعدوم خاصم ہوتی ہین اور پختہ بھی ہون تو کب تک رہین گی طاق گری تو کھنڈر ہوکے رہگیا پھر معمولی قبرون کی کیا بساط ہے اس وقت میر کی روح مؤلف علام سے یہ کہہ رہی ہے سہ

کسانکہ ہیچ نفہمیدہ اند درہمہ عمر
بعیب جوئی من جملہ نکتہ دان شدہ اند

نمبر۔ اب دوسرے ٹکڑے پر نظر فرمائیے یعنی جو ہماری خاک پر سے ہوکے گذرا رو گیا یہان خاک قبر کے معنون پر ہے اسمین پہلی بات تو یہ داد کے قابل ہے کہ مصنف نے گور کا لفظ دوبارہ استعمال نہین کیا دوسری بات یہ ہے کہ قبر۔ مقبرہ۔ مزار مین سے کوئی لفظ نہین رکھا اور یہ انتہا کی بلاغت ہے اور انتخاب الفاظ کی معراج یعنی کوئی لفظ ایسا نہین رکھا جسمین شان نکلتی ہو بلکہ پہلے مصرع مین گور کہا اور دوسرے مین "ہماری خاک" تاکہ بیکسی مین کچھ اور اضافہ نظر آئے اس لفظ سے کس مپرسی کی کیفیت کچھ اور بڑھ گئی درپیش قبر کی بیکسی اور اداسی سب کا مرقع صرف "ہماری خاک" کہکر دکھا دیا خاک یعنی قبر اس محل پر ایسا لفظ ہے جو اپنے معانی کی تصویر ہے اور اہل فن جانتے ہین کہ ایسے لفظ رکھدینا جنمین اپنے مفہوم کی تصویر بھی ہو زیادہ اثر رکھتا ہے جیسے جانے ولادت کیلئے مسقط الراس

دسرکے گرنے کی جگہ) اس لیے کہ اکثر بچہ سر کے بل ہی پیدا ہوتا ہے اسکے
سوا بحر بھی طولانی۔ میر نے پہلے مصرع مین "مدت تلک" اور دوسرے
مصرع مین "جو ہماری خاک پر" کے ٹکڑے رکھکر شعر اس خوبصورتی سے
سمیٹا ہے کہ بے اختیار واہ نکل جاتی ہے۔ کاش مؤلف کتاب فن کے
عام مسائل ہی سے واقف ہوتا۔

ہماری شاعری کا مقدا آخری اشاعت صفحہ ۴۹

ارشاد ادیب " تیسری مثال نظیر کا ایک قطعہ ہے

ایکدن اک استخوان پر جا پڑا میرا جو پاؤن
کیا کہون اُسوقت میرے دل مین کیا کیا دھیان تھے
پاؤن پڑتے ہی غرض اس استخوان نے آہ کی
اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے
دست و پا زانو و سر گردن شکم پشت و کمر
دیکھنے کو آنکھ اور سننے کے خاطر کان تھے
ابرو بینی جبین نقش و نگار و خال و خط
لعل و مروارید سے بہتر لب و دندان تھے
رات کو سونے کو کیا کیا نرم و نازک تھے پلنگ
دن کو خاطر بیٹھنے کے تخت اور ایوان تھے
ایک ہی جھٹکا اجل نے آن کر ایسا دیا

پھر نہ تو ہم تھے نہ وہ سب عیش کے سامان تھے

ایسی بے رحمی سے مت رکھ پاؤن ہم پر اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

اب اس کے مقابلہ مین میر کا قطعہ دیکھئے۔

قطعہ

کل پاؤن ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستون سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — مین بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

دونون شاعرون نے ایک ہی طرح کا واقعہ بیان کیا ہے اور ایک ہی اثر لیا ہے مگر جو زور اور جتنا اثر میر نے دونون شعرون مین بھر دیا ہے اُس کا عُشر عشیر بھی نظیر کے سات شعرون مین نہ سما سکا اس کے اور اسباب بھی ہون گے لیکن خاص سبب یہی ہے کہ میر نے اختصار سے کام لیا اور نظیر نے بیکار طول دیا۔ نظیر بھی اگر اختصار پر نظر رکھتے تو اُن کے قطعہ مین بھی اثر کا ایک عالم ہوتا۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ اگر ان کے قطعہ سے شروع کے دو شعر اور آخر کا ایک شعر لے لیا جائے اور درمیان کے چار شعر نکال دیے جائین تو یہ قطعہ بن جاتا ہے۔

قطعہ

ایک دن اک استخوان پر جا پڑا میرا جو پاؤن
کیا کہوں اُسوقت میرے دل مین کیا کیا دھیان تھے

پاؤن پڑتے ہی غرض اُس استخوان نے آہ کی

اور اسا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے
ایسی بے رحمی سے مت رکھ پاؤں ہمپر او نقشگیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

"اب اس مختصر قطعہ کا اُن کے اصل قطعہ سے مقابلہ کیجئے اور دیکھئے کہ اختصار سے کلام میں اثر کیونکر پیدا ہو جاتا ہے"

التماس مجنوں - اللہ اکبر اس حسن پہ یہ بے نیازیاں ہم مؤلف کتاب کی خاطر سے تھوڑی دیر کے لئے مانے لیتے ہیں کہ نظیر کے قطعے میں کچھ زیادہ شست ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ کون نکال سکتا ہے اور کیونکر نکال سکتا ہے کہ اسکا سبب اشعار کی زیادتی ہے - ہاں اگر ضرورت ہو تو شعر آورد یہ ضرور کہا جا سکتی ہے کہ جب طبیعت مساعدت نہ کرے تو زبردستی شعر نہ کہو اور اگر وہ کہہ گئے ہو تو چست اشعار انتخاب کرلو - لیکن اشعار کی چستی اور خوبی کو اختصار کی بیجز نمائی سمجھنا دانائی نہیں - قطعہ قصیدہ پانچ پانچ شعر کے ہوتے ہیں مگر ان میں سے ایک شعر بھی نکال ڈالنا آسان نہیں ہوتا - ہم دو مختصر سے قطعے نقل کرتے ہیں اور ہے کوئی جو ان میں سے ایک شعر بھی حذف کر دینے کی قدرت رکھتا ہو -

قطعہ غالب - بے ثباتی عیش دنیا

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گلفروش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

قطعہ ہاتف اصفہانی در باب بلندی ہمت

خار بہ رودن بمژگان خارہ بشکستن بدست
سنگ خائیدن بدندان کوہ ببریدن بچنگ

لب بدنبال عقرب بوسہ بر دندان مار
پنجہ با چنگال ثعبان عوض در کام نہنگ

از سر پستان شیر شرزہ دوشیدن حلیب
وز بنِ دندانِ مار گرزہ نوشیدن شرنگ

تیرہ غولے روز بر گردن کشیدن خیز خیز
پیرزالے در بغل شب بر گرفتن تنگ تنگ

طعمہ بر کردن بہ خشم از کام شیر گرسنہ
صید بگرفتن بہ جبر از برخن غضبان پلنگ

تشنہ کام و پا برہنہ در تموز و سنگلاخ
رہ بریدن بے عصا فرسنگہا با پائے لنگ

نقشہا بستن شگرف از کلک مو بر آب تند
نقشہا کردن پدید از خار تر بر خارہ سنگ

صدرہ آسان تر بود بر من کہ در بزم لئام
بادہ نوشم سرخ سرخ و جامہ پوشم رنگ رنگ

چرخ گرد از ہستی من گر برآرد گو برآر
دور بادا دور از دامان نامم گرد ننگ

اب ہم ذرا دیر کیلئے مؤلف علام کی خاطر سے نظیر کے قطعہ میں چند اشعار بڑھائے دیتے ہیں اور انھیں قافیوں کا التزام رکھتے ہیں جو اس استخوان کو نکالے ڈالتے ہیں

قطعہ

ایک دن اک استخوان پہ جا پڑا میرا جو پانون
کیا کہوں اس وقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے

پانوں پڑتے ہی غرض اسنے بھری اک آہ سرد
اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے

بارقہ در پر جبین تھی صاعقہ در کف نگاہ
جلوہ پرور آنکھ تھی اور نغمہ پرور کان تھے

اہل دل کو طور کے جلوے دکھاتی تھی ہنسی
لب حجاب قدس تھے حسن ازل دندان تھے

جگمگاہٹ تخت کی وہ تھی کہ شرماتا تھا مہر
آسمان بھی جن سے شرمندہ تھے وہ ایوان تھے

ایک اک گوشہ تھا گھر کا غیرت باغ ارم
جو تصور میں نہ تیرے آئیں وہ سامان تھے
ایسی بیدردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
آج ایسے ہیں کبھی لیکن خدا کی شان تھے

انکشاف راز یعنی تحقیق مقام

اب اس قطعہ میں چستی بھی ہے بلندی بھی ہے زور بھی ہے شور بھی ہے اور ہمارے بڑھائے ہوئے اشعار نظیر کے ابتدائی اشعار سے زیادہ رفیع المنزلت نظر آتے ہیں مگر ذوق سلیم کہتا ہے کہ تمام معجزہ آرائیاں یہ تمام قدرت نمائیاں بے محل ہیں اس لئے کہ قطعہ پابند ہے اپنے آخری شعر کا اور وہ شعر اس قطعہ کا یہ ہے ۔

ایسی بیدردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

شاعر نے آخر میں کہا تو یہ کہا کہ ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے اس لئے ضروری ہے کہ مصرعے ایسے لگائے جائیں کہ قطعہ اس مصرع پہ تمام ہو سکے ہم نے سب قافیے بٹھا دئے مگر جب آخری شعر پہ پہونچے تو آخری مصرع بدلے بغیر چارہ نہ ہوا ہمارا دعویٰ ہے کہ نظیر کے قطعہ میں کہیں جھول نہیں اس کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے ؎

ایک دن اک استخوان پر جا پڑا میرا جو پاؤں
کیا کہوں اسوقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے

اس شعر میں کہتا ہے کہ میں نے اس ہڈی پر دیدہ و دانستہ پاؤں نہیں رکھا تھا

بلکہ جا پڑا تھا اس کی وجہ دوسرے مصرع مین بتاتا ہے یعنی اسوقت میرے
دل مین ہزارون خیال تھے اور مین اُنھین مین محو چلا جا رہا تھا کہ یہ واقعہ
پیش آیا۔ دوسرے مصرع مین دو ٹکڑے خصوصیت سے
لحاظ کے قابل ہین اول تو کیا کہون دوسرے کیا کیا دھیان تھے۔ کیا کہون کا
کا مفہوم تو یہ ہے کہ بیکار طول ہوگا یا وہ خیالات ہین جن مین اُلجھا ہوا
تھا قابل اظہار نہین ہین یا بیان مین نہین آسکتے۔ آگے بڑھکر کیا کیا دھیان
تھے کہا ہے یہ ٹکڑا اسقدر معنی خیز ہے کہ انسان کے دل مین جتنے بھی خیال آسکتے
ہین سب اس کی شرح مین لکھے جا سکتے ہین ۔

دوسرے شعر مین ؎

پاؤن پڑتے ہی غرض اُس استخوان نے آہ کی
اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے

بظاہر لفظ "غرض" بھرتی کا لفظ معلوم ہوتا ہے مگر ایسا نہین ہے کیا کہون
اُسوقت میرے دل مین کیا کیا دھیان تھے یعنی مین اپنے خیالات سے
قطع نظر کرتا ہون اور واقعہ بیان کرتا ہون یعنی خلاصہ کلام یہ ہے کہ پاؤن
پڑتے ہی اُس ہڈی نے ایک آہ کھینچی ۔ اور کہا کہ اے ظالم آج یہ حال ہے
مگر کبھی ہمارے بھی جان تھی۔ ابھی تک اُس ہڈی نے صرف یہ کہا ہے کہ
ہم جاندار تھے یہ نہین بتایا کہ حیوانات کے کس طبقے مین سے تھے تیسرے
شعر مین ؎

دست و بازو سر و گردن شکم پشت و کمر
دیکھنے کو آنکھ اور سننے کی خاطر کان تھے

بھی شعر اول کی شرح ہے۔ چوتھے شعر کے پہلے مصرع ؎

ابرو بھی جبین نقش و نگار و خال خط لعل و گہر وارید سے بہتر لب و دندان تھے

مین حقیقت کے چہرے سے نقاب سرکنے لگا اور کھل گیا کہ یہ بڑی کسی انسان کی ہے دوسرے مصرع نے یہ بتایا کہ معمولی انسان نہین تھے بلکہ حسین و جمیل انسان تھے ہمارے ہونٹ اور دانت لعل و گوہر سے بہتر تھے جب یہ کہہ چکا کہ انسان تھے تو یہ کہا جا رہا ہے کہ صرف حسین ہی نہ تھے صاحب جاہ بلکہ صاحب تاج و تخت تھے ہمارے یہان تمام سامان عیش مہیا تھے۔ چھٹے شعر سے تباہیون اور بربادیون کی ابتدا و انتہا کا سراغ ملتا ہے ؎

ایک ہی جھٹکا اجل نے آن کر ایسا دیا
پھر نہ تو ہم تھے نہ وہ سب عیش کے سامان تھے

یعنی موت کے ایک ہی جھٹکے مین نہ ہم رہے اور نہ وہ عیش کے سامان رہے یہ شعر انسان کی مجبوری اور موت کی قدرت کا بنظیر مرقع ہے اسباب سے مراد وہ سامان جو متکلم کی نظر مین ہین نہ اتنے ہی جتنے اوپر بیان کیے گئے آخر شعر مین۔ ایسی بے دردی سے ہم پہ پاؤں مت رکھ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

مین التجائے رحم ہے اور اپنی امارت وجاہت اور حسن صورت سب کا ذکر کر چکنے کے بعد کہتا ہے کہ اس بیدردی اس بے رحمی سے ہمکو پامال نہ کر ارے بھائی آخر ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے۔ مختصر یہ ہے کہ نظیر کا قطعہ ایک اثر کا عالم ہے اور اس مین ایک مسلسل تماشے کی شان پائی

جاتی ہے اور یون خیال کی تصویر لفظون مین نظر آنے لگتی ہے جیسے
عالمِ تصور مین تصویر یار بتدریج نمایان ہوتی ہے یا دریا کی پری دریا
سے اُبھرتے اُبھرتے بالائے آب نظر آنے لگتی ہے کیونکر کہون کہ
اس قطعہ مین سُست اشعار ہین۔

مؤلف علام نے اس قطعہ کے متعلق ۲ صفحے سیاہ کیے مگر نتیجہ کچھ
بھی نہین دعوی بے دلیل ایسی یہان اختصار اور طول کو اثر سے کوئی
رابطہ ہے نہ بے اثری سے تعلق ۔ یہ قطعہ میان نظیر کی جیتی جاگتی تصویر
ہے بلکہ خود میان نظیر اسمین جلوہ گر نظر آتے ہین وہی اُنکی افتادِ طبع وہی سادگی مزاج
وہی فروتنی وہی انکسار مجبوری سے صاحب تخت و ایوان
سب کچھ کہا مگر آخر مین یہ کہہ کے چپ ہو رہے "او میان ہم بھی کبھی
تیری طرح انسان تھے" میان نظیر کا عام انداز یہی ہے اُن کے
کلام پر نظر کرنے اور تذکرون کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی
طبیعت مین دریا کی روانی تھی مشاہدات کا چربا اُتارنے مین مانی و بہزاد کے
اُستاد تھے ہان خیالات مین بلندی کم تھی شعر مین زیادہ جگر کاوی نہ کرتے تھے
اُنکی نظمین اکثر فرمائشی ہوتین اور فرمائش کرنے والون کیلیے کسی شعر خاص
کی قید نہ تھی جب کوئی فرمائش ہوئی جو ذہن مین آیا قلم برداشتہ لکھ کر دے دیے
نظر ثانی کرنا اُنکی خو نہ تھی مگر اس قطعہ مین الفاظ نہین رکھے نگینے جڑ دیے
ہین قصہ مختصر نظیر کا یہ قطعہ سوز و گداز کا مرقع ہے اور درد و اثر کا طلسم
اور مؤلف علام کی دسترس سے باہر ہے۔ اس مین شک نہین ہے کہ

اُس اُستخوان کے ٹکڑے میں تنافر کلمات ہے اور البتہ بُرا معلوم ہوتا ہے
اب رہا میر کا قطعہ اُس کے لاجواب ہونے میں کسے شک ہو
کافر ہے اس قطعہ میں بھی خود میر نظر آتے ہیں وہی جلال وہی تمکنت وہی
وہی بانکپن سوز و گداز نظیر کے قطعہ میں جلوہ گر ہے تو ہیبت و استکبار
میر کے قطعہ میں دیکھئے ناسہ

کہنے لگا کہ دیکھ چل راہ بے خبر میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

میں وہی سپاہی کے بگڑے ہوئے تیور ہیں۔ نظیر کے قطعہ میں
نرمی اور نصیحت ہے میر کے قطعہ میں گرمی اور نصیحت نظیر کے
قطعہ میں غرور سے پہونچنے والی تکلیف کا اظہار ہے اور اپنی اہانت
پر غصہ نظیر کے قطعہ میں پامال ہونے کی تکلیف کا اظہار ہے اور
بیدردی کا شکوہ ۔ رحم کی التجا ہے اس لئے دونوں کا تقابل
لایعنی سی بات ہے علاوہ اس کے میر کا پاؤں پڑا ہے کاسہ سر
پر نظیر کا پاؤں پڑا ہے ایک ہڈی پر جو خدا جانے کس کی اور کہاں
کی تھی اس لئے اس نے پہلے اپنے کو جاندار بتایا پھر انسان
پھر خوبصورت انسان پھر صاحبِ جاہ و دولت اور آخر میں کہا
کہ ان سب باتوں سے قطع نظر کرکے صرف اتنا ہی سمجھ لے کہ
ہم تیری طرح انسان تھے اور ہم پر رحم کر۔ ایسی بیدردی
بھی کیا ۔ نظیر نے ابتدا ہی سے یہ کہہ دیا کہ استخوان سے آہ سرد
کھینچی اور پامال کرنے والے کے اس فعل کو بیدردی اور

بے رحمی سمجھا اُن کو بھول کر بھی یہ خیال نہین آیا کہ غرور اس کا
باعث ہے اور یہین سے ان کا انداز طبیعت جھلکتا ہے میرؔ کا
پاؤن پڑا کاسۂ سر پہ اور اُس سر نے کہا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
مین بھی کبھی کسی کا سر پُر غرور تھا یعنی یہان اگرچہ پاؤن کاسہ سر
پہ بے ارادہ جا پڑا تھا مگر سمجھا یہ گیا کہ غرور کے سبب سے ٹھکرایا
ہوا چلتا ہے اس لئے آگے بڑھ کر کہا ہے مین بھی کبھی کسی کا
سر پُر غرور تھا۔ یاد رہے کہ مغرور سے خطاب کا انداز اہل دل
کے ہان اور ہے اور بیدرد ظالم سے اور۔ میرؔ کے قطعہ مین
ایک بات یہ بھی ہے کہ صاحب سر کی تنک مزاجی کا آئینہ
ہے اس لئے کہ جہان کوئی بات ایسے مزاج والون کے خلاف
گذری اُن کے تلوون سے لگتی ہے سر مین پہنچتی ہے اور فوراً نہایت تند و
تلخ بات کہہ اٹھتے ہین نظیرؔ کے قطعہ مین اطناب ہے اور میرؔ کے قطعہ مین ایجاز۔ نظیرؔ کے
قطعہ مین ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ اُس کو اپنی موجودہ
بے بسی اور بے سروپائی کا بھی احساس ہے اس لئے گرمی
نہین کرتا نرمی کرتا ہے۔

ایسی بے رحمی سے ہم پر پاؤن مت رکھو اے نظیرؔ
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

اس شعر مین یہ ٹکڑے ایسی بے رحمی سے ہم پر پاؤن مت رکھو
اے نظیرؔ، اور او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے،

کس قدر دلگداز اور ترحم انگیز ہیں۔ ماہر نفسیات جانتا ہے کہ
جس نصیحت میں ناصح کے تیور بگڑے ہوئے ہوں وہ دل پر
اثر تو کرتی ہے مگر ناصح کی طرف سے نفرت بھی پیدا کرتی ہے مگر خود وہ انکو اسکی
پرواہی کب ہوتی ہے یہ بات میر کے قطعہ میں ہے نظیر کے قطعہ میں یہ اثر ہے
کہ نفرت کی جگہ انفعال پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گداز دل
بھی اور اس طرح کی نصیحت کا اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے مختصر یہ کہ

مصرع لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

ایک بات یہ بھی ہے۔ نظیر نے نہایت ہی نرمی سے اپنا صاحب
تاج و تخت ہونا بیان کیا ہے میر نے صرف سر کو سیر پر غرور
بتایا ہے۔ میر کے [illegible] میں اگر زیادہ اشعار ہوتے تو ماہر نفسیات انسانی کا انتا مشکل ہو جاتا۔

نوٹ ۔ میں نے میر کے قطعہ کی زیادہ توضیح نہیں کی۔
اس لئے کہ اس کی چستی اس کی تاثیر اس کے جوش و خروش
کا اعتراف خود مؤلف علام نے کیا ہے۔

ہماری شاعری کا مقصد اشاعت آخر صفحہ ۳۷

بلندی خیال کی مثالیں ارشاد ادیب

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

حضرت یاس عظیم آبادی

التماس مجود۔ جناب ادیب نے حضرت یاس عظیم آبادی کے اس شعر کو بلندی خیال کی مثالوں میں صفحہ ۳۷ پر جگہ دی ہے اور کسی مستفسر کے استفسار پر ضمیمہ کتاب صفحہ ۱۹۴ سے صفحہ ۱۹۶ تک اس کی شرح فرمائی ہے جو یہاں نقل کی جاتی ہے اور شعر کی تنقید کر کے دکھایا گیا ہے کہ من چہ سرایم وطنبورۂ من چہ می سراید کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل ہے

شرح جناب ادیب۔ جناب مؤلف کی دی ہوئی مثالیں زیادہ تر ایسی ہی ہیں یعنی غلط ہیں سقیم ہیں بے محل ہیں ....

....

ارشاد ادیب۔ شاعر کا خیال ہے کہ جس کو بخت نارسا نہ ملا وہ بدنصیب ہے۔ ظاہر بین تو یہ ایک اجتماع ضدین معلوم ہوتا ہے مگر نکتہ رس نگاہ کو اسی ظاہری اجتماع ضدین میں ایک نہایت ہی بلند خیال چھپا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک بخت کی رسائی خوش نصیبی اور نارسائی ہے کیا؟ اپنی خواہشوں اور ارادوں کا پورا ہونا یا نہ ہونا۔ تو عوام کے معیار کے مطابق خوش نصیب وہ ہے جس کی خواہشوں

اور ارادون کا پورا ہونا یا نہ ہونا۔ تو عوام کے معیار کے مطابق خوش نصیب وہ ہے جس کی خواہشین اور ارادے پورے ہوتے رہین اور بدنصیب وہ ہے جس کی خواہشین اور ارادے پورے نہ ہون۔ لیکن شاعر انسان کے رتبے کی بلندی اور خواہشون اور ارادون کی کم حقیقتی پر نظر کرکے خوش نصیبی اور بدنصیبی کے اس معیار کو بہت پست سمجھتا ہے۔ اُس کے نزدیک خوش نصیبی اور بدنصیبی کا معیار خداشناسی ہے جو اصل مین مترادف ہے حق شناسی اور حقیقت شناسی کا اور جس سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی فضیلت انسان کے لئے ہو نہین سکتی یعنی خداشناسی کی فضیلت جس کو حاصل ہو وہ خوش نصیب ہے اور جس کو حاصل نہ ہو وہ بدنصیب ہے۔

اب ایک طرف اس معیار کو نظر مین رکھئے اور دوسری طرف دیکھئے کہ جس شخص کو بخت نارسا نہین لگتا یعنی جس کی خواہشین اور ارادے ہمیشہ پورے ہوتے رہتے ہین وہ عیش و آرام مین پڑکر خدا کو بھول جاتا ہے اور خداشناسی اور خداپرستی سے محروم ہوکر ارادہ پرست ہو جاتا ہے۔ مکرمی جناب سید آل رضا صاحب نے ذیل کے شعر مین اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کام میرے۔ مرے بنائے بن نہ سکین خدا کرے
تو بہ کہین شک آ نہ جائے قدرت کارساز مین

اس کے برخلاف جس شخص کی زندگی تلخیون اور ناکامیون مین

گذرتی ہے اس کا دھیان خدا کی طرف مائل رہتا ہے اور اس میں
ارادہ پرستی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ ایک قدیم شاعر کہہ گیا ہے
"دکھ میں ہر کو سب بھجیں اور سکھ میں بھجے نہ کوئے"

غرضکہ بالعموم رہے یا بالعموم کی کوئی ایسی ہی بخت نارسا انسان
کو خدا شناس اور بخت رسا ارادہ پرست بنا دیتا ہے اور چونکہ شاعر
کے معیار کے مطابق خوش نصیبی کا انحصار خدا شناسی کے حاصل ہونے
اور نہ ہونے پر ہے۔ اس لئے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جس کو بخت نارسا ملے
وہ خوش نصیب ہے اور جس کو نہ ملے وہ بد نصیب ہے۔

اب ذرا شعر کے انداز بیان پر نظر کیجئے۔ خوش نصیبی اور بد نصیبی کا
معیار بتانا شاعر کا مقصود نہیں ہے اس کے نزدیک تو مذکورہ معیار
بالکل مسلم ہے۔ اس لئے وہ اپنے بخت کی نارسائی پر پست خیال لوگوں
کی طرح واویلا نہیں مچاتا بلکہ خوش ہوتا ہے اور فخر کے لہجے میں کہتا
ہے۔ خدا شناسی اور خدا پرستی کی اگر تلاش ہو تو مجھ سے خوش نصیبوں
کو دیکھو جنھیں بخت نارسا کی بدولت یہ نعمتیں حاصل ہوئی ہیں۔

شاعر اپنے اس خیال کی بنا پر ظاہری بد نصیبی کو حقیقی خوش نصیبی
سمجھتا ہے اور اس طرح غم میں خوشی مصیبت میں تسکین اور مایوسی
میں امید کا ایک زبردست پہلو نکال کر اپنے دل کو افسردہ اور طبیعت
کو مردہ نہیں ہونے دیتا۔ اور مردانہ وار تمام تکلیفوں کا مقابلہ
کرنے کو تیار رہتا ہے۔

یہ شعر مبنی ہے۔ حضرت علیؑ کے اس حکیمانہ قول پر "عرفت ربی بفسخ
العزائم" یعنی میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ ہو جانے سے پہچانا
الناس یحیوہ۔ جناب مؤلف بھولتے ہیں ناکامی پیہم کا یہ اثر بھی ہوتا ہے انسان
ہستی واجب کا انکار کر بیٹھتا ہے اسمیں شک نہیں کہ مصرع ثانی (وہ بدنصیب جسے بخت نارسا
نہ ملا) میں صاحب بخت رسا کو بدنصیب کہنا ایک جدت ہوتا اور
اس کی داد نہ دینا مشرب سخن سنجی میں کفر قرار پاتا اگر جبھی کہ شعر بے نیاز نہ
نہ ہوتا مصیبت تو یہ ہو کہ اچھا شعر نام ہے دو مصرعوں کے مجموعہ کا
جس میں کوئی مفہوم شعریت لئے ہوئے ادا ہو جائے مگر افسوس کے
ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس شعر میں کوئی مفہوم ادا ہی نہیں ہوا
شاعر کا مفہوم ذہنی تو یہ ہے کہ جس خود پرست (مغرور) کو بخت نارسا
نہ ملا وہ بدنصیب ہے خودی کا بندہ ہے خداشناس نہیں
لیکن الفاظ شعر ادائے مطلب میں قاصر ہیں اور زبان الکن سے
بھی زیادہ قاصر۔ اس شعر میں دو غلطیاں ہیں انہیں سے ایک غلطی تو
اس لفظ کی ہے جس نے شعر میں ندرت خیال و جدت ادا کی جھلک
دکھائی تھی۔ مگر ایک تا ؤ کی کسر رہ گئی اور صرف تانبے کے بالائی سطح پر
کندن کی جھلک پیدا ہو سکی باطن سیاہ کا سیاہ رہ گیا وہ جھلک بھی
نگاہ نقاد کی گرمی پاکر اڑ گئی اور اب اس کی جگہ خالی سیاہی باقی رہ گئی ہے
شعر کی پہلی غلطی تو یہ ہے کہ شاعر نے تعمیم کی شان پیدا کر دی
جو عقل و مشاہدہ دونوں کے خلاف ہے ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ

ہر ایک ایسا آدمی بدنصیب ہے جو قسمت نارسا نہ رکھتا ہو اس قول کا صریح البطلان ہونا ظاہر ہے ایسے اقبالمند لوگ نایاب نہیں جو اپنے ارادون مین برابر کامیاب ہوتے ہین اور اُن کی بندگی اوج کمال کے مدارج طے کرتی جاتی ہے اور آخر مین ہمہ تن بندگی اور سراپا نیاز بن کر رہ جاتے ہین بابر ابراہیم لودی اور رانا سانگا کے معرکون مین مظفر و منصور ہوتے ہی سجدۂ شکر مین گرتا ہے اور بہت سے شاہنشاہ جب اپنی تمناؤن مین کامیاب ہوتے ہین سجدۂ نیاز مین اُن کی پیشانی زمین عجز کو بوسہ دیتی نظر آتی ہے اگر بہوطا اور متعدد تاریخین دیکھنے مین تکلیف ہو تو صرف سیر المتاخرین کا مطالعہ ہی منکر کی تسکین قلب کے لئے کافی ہوگا ہان اچھے اور بُرے ایسے کم ظرف بھی ہین (مگر بہت کم ہین) جو ایک چلو مین بہک اُٹھتے ہین بلکہ ایک بوند مین چھلک اُٹھتے ہین جناب ذوق علیہ الرحمہ کو یہی مفہوم ادا کرنا تھا ادا کیا مگر ضروری قیدون کے ساتھ سے

نشہ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا
سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا

ذوق

اس قمیم نے شاعر کا بسا بسایا گھر اُجاڑ کے رکھ دیا۔

مین نے یہ زحمت صرف ہماری شاعری کے مولفت کی خاطر سے گوارا کی ورنہ مشاہدات عام کے متعلق نہ کسی دلیل کی حاجت

ہوتی ہے نہ کسی ثبوت کی ضرورت

دوسری غلطی - پہلے مصرع یعنی بجز ارادہ پرستی خدا کو
کیا جانتے ہیں ارادہ پرستی کا ٹکڑا مراد قائل سے بیزار ہے اس
لئے کہ شاعر کا مفہوم ذہنی صرف یہ تھا کہ بعض ایسے لوگ جو
اپنی ہر تمنا اور اپنے ہر ارادہ میں کامیاب ہوتے ہیں وہ مغرور
و خود پرست ہو جاتے ہیں اور خدا والی و خدا پرستی و خدا
شناسی سے دور جا پڑتے ہیں اپنے امور میں خدا سے برکت نہیں
چاہتے شکر نعمت میں زبان نہیں ہلاتے دعا کے لئے ہاتھ نہیں
اٹھاتے بلکہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا ہماری ہے جو ہم چاہتے ہیں
وہی ہوتا ہے بلکہ زمانہ ہم ہیں جسے چاہیں معراج پر پہونچائیں
جسے چاہیں تحت الثریٰ میں گرائیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ خدا کو بھول جاتے ہیں اور یہی انتہائی بدنصیبی ہے مگر
خود پرستی یا خودی کا مفہوم ادا کرنے والا کوئی لفظ شاعر
حسب ضرورت ڈال نہ سکا اور لگی الٹی گنگا بہنے۔ میں اپنے مفہوم کو زیادہ
واضح کئے دیتا ہوں - ارادہ پرستی - ارادہ کی پرستش کرنا
ظاہر ہے کہ یہ ٹکڑا کتنا اصل مفہوم کے خلاف ہے کہیں ایسے
لوگ ارادہ کی پرستش کرتے ہیں ارادہ خود اُن کی پرستش کرتا
ہے یعنی اِدھر ارادہ ہوا اُدھر کامیاب ہوئے شاعر نے یہاں عبد
کو معبود اور معبود کو عبد بنا دیا اب جو بندہ تھا وہ خدا ہے اور جو خدا

تھا وہ پابندہ رہے اس لئے جب تک ارادہ پرستی کا ٹکڑا شعر میں موجود ہے معنی کرسی نشین ہو نہیں سکتے اور لفظوں میں تلوار چل جانا اسی کا نام ہے ارادہ کی پرستش کرتے ہیں وہ لوگ جو بار بار اپنی کوششوں میں ناکام رہتے ہیں مگر اس کام کو یہ کہکر نہیں چھوڑ بیٹھتے کہ بھاری پتھر دیکھا چوم کر چھوڑ دیا اور چھوڑتے کیوں نہیں اس لئے کہ بات کے دھنی اور دھن کے پکے ہوتے ہیں۔

اگر وہی مفہوم ادا کرنا تھا جو ہم نے شاعر کے مفہوم ذہنی کے تحت میں بیان کیا ہے اور جس کے سوا کوئی مفہوم صحیح اس محل پر ہو ہی نہیں سکتا تو ارادہ پرستی اور "نصیب" کے ٹکڑوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا تھا اور یوں کہنا چاہئے تھا۔ ؎

خودی کے بت کا ہے بندہ خدا کو کیا جانے
وہ خود پرست جسے بخت نارسا نہ ملا

ندرت خیال اس شعر میں تھی ہی نہیں اس لئے کہ یہ عرفت ربی بفسخ العزائم کے مشہور قول کا چربا ہے جدت ادا کی چھاؤں ابھر ضرور پڑی تھی مگر پڑتے ہی غائب ہو گئی اس کا سبب یہ ہے کہ شاعر نے ادائے مطلب کی بنیاد لفظ "بدنصیب" پر رکھی تھی وہ شعر میں کسی طرح نہ رہ سکی اور اسے "پرغرور" یا "خود پرست" کیلئے جگہ خالی کرنی پڑی تو جب بنیاد ہی اکھڑ گئی تو وہ سر بفلک کشیدہ عمارت جو صرف مصنف کے عالم خیال میں جلوہ گر تھی اڑا کے

بیٹھ گئی انا للہ و انا الیہ راجعون مجھے اس محل پر اپنا یہ شعر بے ختیار
یاد آتا ہے -

بیخود موہانی

خیالِ آرزو ہی تھا کہ یاس نے یہ دی خبر
وہ کسیہ تیر اُڑ گیا ابھی جو بن چکا نہ تھا

اب اگر جناب ادیب کی شرح کا خیال کرکے سکوت کیا بھی جائے
تو لسان الغیب کی یہ آواز فضا میں گونج رہی ہے -

ع این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

باقی آئندہ

یار زندہ صحبت باقی

بندۂ ناچیز خاکسار محمد احمد بیخود موہانی
(ایم اے منشی فاضل)
پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ
۱۵ - نومبر ۱۹۳۷ء